جزا، سزا اور آخرت

ہم نے غالبؔ کے دینی عقائد کو زیادہ ٹٹولنے کی کوشش نہیں کی۔ ایسے شخص کا مذہب دریافت کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن اس کے فارسی کلام میں بہت زیادہ اور اردو کلام میں مقابلتاً کم ایسے اشعار ملتے ہیں جس میں اس نے اپنا "ہمہ اوست" کا عقیدہ بیان کیا ہے۔ حالیؔ نے بھی لکھا ہے کہ غالبؔ وحدۃ الوجود کا قائل تھا۔ اکثر مسلمانوں کو وحدۃ الوجود پر یہی اعتراض رہا کہ اس میں اسلامی توحید کی صورت بدل جاتی ہے اور شریعت کا پہلو دب جاتا ہے۔ غالبؔ کے متعلق یہ دونوں باتیں درست ہیں۔ وہ خدا سے الگ آفاق کے وجود کا قائل نہیں۔ ساری موجودات کو خدا کا عالمِ خیال سمجھتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی　　ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

یہ حلقۂ دامِ خیال انسان کے نفس کی کیفیت نہیں بلکہ خدا کے شعور کی کیفیت ہے۔ ہستیٔ مطلق کا رابطہ اپنے مظاہر سے اور خالق کا رشتہ مخلوق سے کس انداز کا ہے۔ اس میں تمام فلسفے ظن آرائیاں کرتے ہیں۔ کوئی خالق کے وجود کو مخلوق کے وجود سے الگ اور اس سے ماورا سمجھتا ہے۔ اور کسی کے نزدیک ان کے درمیان کوئی خلیج یا پردہ حائل نہیں۔ ظاہر اور باطن سب وہی ایک حقیقت ہے۔ لیکن اگر خالق کو مخلوق سے بالاتر نہ سمجھیں تو خیر و شر، حق و باطل سب کو خدا کی طرف منسوب کرنا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں پرستش کے بھی کوئی معنی نہیں رہتے۔ چنانچہ توحید کے قصیدۂ اوّل میں غالبؔ کہتا ہے کہ

دیدہ بیرون و درون از خویشتن پُروانگی
پردۂ رسمِ پرستش درمیاں انداختہ

اگر عابد اور معبود ایک دوسرے سے الگ روبرو ہوں ایک بندہ ہو ایک آقا، ایک عاجز ہو اور دوسرا فریادرس و مشکل کشا۔ ایک گنہگار ہو اور دوسرا بخشنہار تو دعا اور عبادت کے کچھ معنی ہوتے ہیں، لیکن اگر مانگنے والا اور جس سے مانگا جاتا ہے ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہوں تو بندگی کی کوئی مستقل حقیقت نہیں رہتی۔ ایک حکیم نے لکھا ہے کہ وحدتِ وجود مان لینے سے انسان کو اخلاقی تعطیل حاصل ہو جاتی ہے۔ عبادت اور جزا و سزا سے چھٹی ہو جاتی ہے۔ غالبؔ کہتا ہے کہ خدا نے خود ہی اپنے ماسوا کا ایک دھوکا پیدا کیا ہے۔ حرفِ کُن سے مخلوق کو خلق کر کے سب کو دوئی کے گمان میں ڈال دیا ہے۔ اندر بھی وہی اور باہر بھی وہی۔ بیچ میں رسمِ پرستش کا ایک موہوم پردہ لٹکا دیا ہے ؎

اے زوہمِ غیر غوغا در جہاں انداختہ
گفتۂ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ
دیدہ بیرون و درون از خویشتن پُروانگی
پردۂ رسمِ پرستش درمیاں انداختہ

جو لوگ وحدۃ الوجود سے عقلی نتائج اخذ کرتے اور سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خدا ہی کا عمل اور خدا ہی کا خیال ہے۔ ان میں اکثر تمیزِ خیر و شر کمزور ہو جاتی ہے۔ اور حفظِ مراتب دشوار ہو جاتا ہے۔ نشاطِ معنوی ہو تو بھی خدا کی طرف سے ہے۔ اور فسونِ بابل ہو تو بھی خدا کی طرف سے۔ غالبؔ کی ایک غزل اسی مضمون کی ہے:۔

نشاطِ معنیاں از شرابخانۂ تُست　　فسونِ بابلیاں فیضے از فسانۂ تُست

دہر میں زمانوں کی تقسیم، حال و ماضی و مستقبل کی تفریق انسان کی محدود نگاہی

سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ حقیقت کا تجزیہ کر کے پھر اسے بحیثیتِ کل نہیں دیکھ سکتا۔ تمام زمانے خدا کے لیے ایک حالِ حاضر ہیں۔ یہ یونہی کہنے کی بات ہے کہ جامِ جہاں نما جمشید نے بنایا اور آئینہ سکندر کے عہد میں بنا۔ ؎

بجام و آئینہ حرفِ جم و سکندر چیست
کہ ہرچہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست

خدا ساری کائنات کو محیط ہے۔ دیر و حرم، کلیسا و کنشت، کعبہ و بت خانہ، سب اس کے احاطے میں ہیں۔ بت کدے میں ہوتے ہوئے بھی سر بر آستانۂ خدا ہی رہتا ہے ؎

ہم از احاطۂ تست ایں کہ در جہاں ما را
قدم بہ بت کدہ و سر بر آستانۂ تست

فلک یا زمانہ ہم سے کچھ چھین لیتا ہے تو ہم افسوس کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ خدا کی کائنات میں کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ نقل مکانی یا تبدیلیٔ ہیئت کو فنا نہیں کہہ سکتے۔ سائنس کا بھی یہی نظریہ ہے کہ طبیعی قوتیں اپنی ہیئت بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن ان میں سے کچھ مطلقاً کالعدم نہیں ہوتا۔ غالب کہتا ہے کہ اگر شعور کو حقیقتِ کلّی سے ہم آہنگ کر لیا جائے تو پھر یہی محسوس ہوگا کہ کچھ ضائع نہیں ہؤا۔ جزو کی تبدیلی سے حقیقتِ کلّی میں فرق نہیں آیا۔ دنیا کو عالمِ کون و فساد کہا گیا ہے۔ لیکن انسان جسے فساد کہتا ہے وہ بھی ایک دوسری ہیئتِ تکوین ہے ؎

سپہر را تو بتاراج ما گماشتۂ
نہ ہرچہ وزد ز ما بُرد در خزانۂ تست

آگے چل کر کہتا ہے کہ مجھ ایسے شخص میں جو کافرانہ شوخی نظر آتی ہے یہ خود میری پیدا کی ہوئی نہیں۔ اور اگر یہ جُرم شمار ہو تو یہ جُرم میرے ذمے نہیں

لگ سکتا۔ اس بگٹٹ عناں گسیختہ مُنہ زور توسنِ فکر میں یہ جولانی کیونکر پیدا ہو سکتی تھی۔ اگر تو خود اس پر تازیانہ نہ لگاتا ؎

مرا چہ جرم گر اندیشہ آسماں پیماست
نہ تیز گامیٔ توسن ز تازیانۂ تست

یہ کائنات تیری ہی شکار گاہ ہے۔ دیسے معلوم ہوتا ہے کہ کمانِ چرخ سے تیر نکلا ہے لیکن ہر خدنگِ بلا میں تیری ہی قضا کے پر ہوتے ہیں ؎

کماں ز چرخ خدنگ از بلا و پر ز قضا
خدنگ خوردۂ ایں صیدگہ نشانۂ تست

(غالباً "یادگارِ غالب" میں بیان کیا گیا ہے کہ اس غزل کا ایک مطبوعہ ورق غالب کے احباب کی محفل میں کہیں ادھر اُدھر فرش پر پڑا تھا۔ مرزا کے احباب میں سے ایک صاحب غالب کو فارسی کے اکابر اساتذہ میں شمار نہ کرتے تھے۔ غالب نے ان سے فرمائش کی کہ دیکھیے یہ کسی کی غزل ہے ذرا پڑھ کر سنائیے۔ غزل لاجواب تھی۔ وہ پڑھتے گئے اور کسی قدیم شاعر کا کلام سمجھ کر داد بھی دیتے گئے۔ لیکن آخر میں الہامی طور پر یہ مقطع آگیا تو وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ؎

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست)

جو شخص تمام مظاہرِ حیات اور تمام مذاہبِ خیال کو ایک ہی ناقابلِ تقسیم ہستی کے مظاہر سمجھے اور کسی جُزو کی حقیقت کو کُل سے الگ موجود سمجھنے کا قائل نہ ہو ایسا شخص موحد تو ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے رسمی عبادت دشوار ہو جائے گی۔ وہ یہ جانتا ہے کہ عبادت گزار کو ضرور فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن اس کی طبیعت اس طرف نہیں آتی۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کبھی کہتا ہے کہ رموزِ دین میں اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ کیونکہ میری فطرت عجمی ہے۔ اور دین و کیش عربی۔ اشارہ اس طرف کرتا ہے کہ دینِ اسلام کے شرعی عناصر میں بہت سی باتیں عربوں کی فطرت کے مطابق، ان کے حالات کی بہتری اور مزاج کی اصلاح کے لیے درج کی گئی تھیں۔ یہ درست ہے کہ ہر دین کسی قدر اپنے معاصرانہ حالات کا آئینہ ہوتا اور ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر سچے اور بلند مذہب میں ابدی حقائق بھی ہوتے ہیں جو زمان و مکان اور مزاج اقوام و ملل کے حدود و قیود سے بالاتر ہیں۔ غالب کے ہاں یہ عذر کسی حد تک درست ہے لیکن اس میں بہانہ سازی کا بھی شائبہ ہے ؎

رموزِ دیں نشناسم درست و معذورم
نہادِ من عجمی و طریقِ من عربی ست

ساتھ ہی عابدوں اور زاہدوں پر چوٹ ہے کہ اگرچہ شراب نوشی خلاف شرع نبیؐ ہے، اور کوئی مستحسن چیز نہیں بلکہ اسے ایک بلا سمجھیے لیکن باطن کی لطافت سے خالی زاہدوں کا ہم پیالہ و ہم نوالہ ہونا اس سے بھی بڑی آفت ہے۔ یعنی میں نے دو بلاؤں میں سے مقابلتہً کم ضرر رساں بلا اور شر کو اختیار کیا ہے۔ اسی قسم کا شعر اقبال کی ابتدائی شاعری میں ملتا ہے ؎

زاہد ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

غالب سے شراب نہ چھوٹ سکی۔ قیامت کو دربارِ الٰہی میں اپنا بیان دیتے ہوئے بھی کہتا ہے کہ میں نے کوئی اور گناہ کبیرہ تو نہیں کیے۔ البتہ شراب ضرور پیتا رہا

ہوں۔ لیکن میری شراب نوشی بھی کوئی شدید قسم کی نہ تھی۔ شراب کا حساب اور عذاب تو بہرام و پرویز و جمشید جیسے شوقینوں کے متعلق ہونا چاہیے۔ مجھ غریب سے کیا حساب لیتا ہے۔ قرض کی شراب پینا اور قرض خواہوں کے تقاضائے زشت سے مضطرب رہنا۔ پیالہ ہے تو شراب نہیں، شراب ملی تو پیالہ ٹوٹ گیا۔ میں نے جو تھوڑی سی شراب نوشی کی ہے وہ بھی اطمینان اور سرور سے نہیں کی۔ اسی بیان میں اپنے اخلاق کے متعلق کہتا ہے کہ میں کوئی ایسا بداخلاق نہ تھا۔ نہ میں نے کسی کو قتل کیا نہ کسی کا مال لوٹا، نہ کسی کی حق تلفی کی۔ خدا سے کہتا ہے تو جانتا ہے کہ میں کافر نہ تھا۔ خورشید پرست اور آتش پرست نہ تھا۔ لے دے کے یہی شراب رہ گئی جس نے میری قبر میں آگ لگا دی۔ تھوڑی سی اس لیے پی لیتا تھا کہ اس سے طبیعت میں ذرا پرواز پیدا ہوتی تھی۔ لیکن یہ پرواز بھی کیا پرواز تھی چیونٹی کی اڑان تھی۔ میری شراب خواری قابلِ عفو سمجھ۔ تو جانتا ہے کہ میں غمزدہ تھا اور شراب عارضی طور پر غم غلط کر دیتی ہے ؎

ہانا تو دانی کہ کافر نیم — پرستارِ خورشید و آذر نیم
نہ کشتم کسے را بہ اہرمینی — نہ بردم زکس مایہ در رہزنی
مگر مے کہ آتش بگورم ازوست — بہنگامہ پروازِ مورم ازوست
من اندوہگین و مے اندوہ ربای — چہ می کردم اے بندہ پرور خدای
حسابِ مے و دامش و رنگ و بوی — ز جمشید و بہرام و پرویز جوی
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند — دل دشمن و چشمِ بد سوختند
نہ از من کہ از تابِ مے گاہ گاہ — بدریوزہ رُخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستاں سرائے نہ مے خانۂ — نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ
نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط — نہ غوغای رامشگراں در رباط
شبانگہ بہ مے رہنمونم شدے — سحرگہ طلبگارِ خونم شدے

تمنائے معشوقۂ بادہ نوش
تقاضائے بے ہودۂ مے فروش

شراب خواری کے متعلق اس کا یہ عقیدہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شراب کو ہر شخص کے لیے ہر حالت میں ممنوع قرار دینا معاشری مصلحت کے لیے ہے۔ شریعت نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ عاقل اور نادان سب کے لیے اسے یک قلم حرام کر دیا جائے قانون ملّت کے مصالحِ عامہ کو مدِ نظر رکھ کر وضع کیا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض حالات میں بعض افراد کو اس سے فائدے کے بجائے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ شریعت کے بہت سے قوانین عوام کی نادانی اور خود غرضی کے پیشِ نظر بنائے گئے ہیں ؎

از مے ترا ہر آئینہ پرہیز گفتہ اند
آرے دروغِ مصلحت آمیز گفتہ اند

علّامہ اقبالؔ ایک روز شیخ محی الدین شیخ اکبر کے خلاف برہم ہو کر مجھ سے فرمانے لگے کہ دیکھو بعض صوفیہ شریعت کے بارے میں کس قدر گستاخانہ کلمے استعمال کرتے ہیں۔ شیخ اکبر شریعت کو دروغِ مصلحت آمیز بتاتے ہیں۔ میں اس کی تحقیق نہیں کر سکا کہ شیخ اکبر نے یہ بات کہاں لکھی ہے۔ بہرحال ضرور لکھی ہوگی۔ اقبالؔ یونہی اپنے دل سے تو یہ بات نہ تراش سکتے تھے۔ ممکن ہے شیخ اکبر کا یہ قول غالبؔ کی بھی نظر سے گزرا ہو۔ اور اس نے اسے اپنی شراب نوشی کے جواز میں استعمال کر لیا ہو۔

غالبؔ کا حال عمر خیّامؔ سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔ عمر خیّامؔ کو مغربیوں نے تو کافر، ملحد اور لذّت پرست سمجھ کر اس کی قدردانی کی لیکن مسلمانوں نے اسے کبھی کافر نہ سمجھا۔ ایک انگریز مصنّف نے اہلِ فرنگ کے اس عام خیال کی تردید کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خیّامؔ کو دہریہ اور منکرِ خدا کیونکر کہ سکتے ہیں۔ وہ لاادری ضرور ہے۔

اور اسے یہ یقین ہے کہ اسرارِ ازل کی گرہ حکمت سے نہیں کھل سکتی۔ بہت سی رباعیوں میں اسی لاادریت اور لاعلمی کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن رباعیوں میں بہت سی ایسی ہیں جن میں وہ خدا سے فطرت کی الجھنوں کے متعلق شکایت کرتا ہے۔ اگر وہ خدا کی ہستی ہی کا منکر تھا تو شکایت کس موہوم ذات سے کر رہا تھا۔ گستاخانہ شکایت بھی کرتا ہے تو خدا کو مخاطب کر کے اور ربّی کہ کہ کرتا ہے ؎

ابریقِ مئے مرا شکستی ربّی ۔۔۔ بر من درِ عیش را بہ بستی ربّی
بر خاک بریختی مئے نابِ مرا ۔۔۔ خاکم بدہن مگر تو مستی ربّی

یہی حال غالبؔ کا ہے۔ وہ اپنے آپ کو گنہگار سمجھتا ہے کافر نہیں سمجھتا ؎

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

محشر کی عدالت میں غالبؔ کا بیان بھی شکایت سے لبریز ہے۔ اس کی زندگی ایسی تلخی میں گزری کہ وہ اسے عذابِ جہنّم سے بدتر سمجھتا تھا۔ چنانچہ ایک مطلع میں کہتا ہے میں اس سے نہیں ڈرتا کہ اس دنیا سے گزر جانے کے بعد مجھے جہنّم میں ڈال دیں۔ مجھے تو اس سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں آگے بھی اسی قسم کی جانکاہ زندگی کا اعادہ نہ ہو جائے ؎

زاں نمی ترسم کہ گردد قعرِ دوزخ جائے من
وائے گر باشد ہمیں امروزِ من فردائے من

اس کا بیان شکایتوں اور حسرتوں کا طومار ہے۔ بسا نوبہاراں بسا روزِ باراں ایسے گزرے کہ میرا سفالینہ جام میرا مے کا پیالہ شراب سے خالی رہا۔ باہر بہار آئی ہے اور میں فکرِ روزگار اور غمِ برگ و ساز میں سر نیچے کیے بیٹھا ہوں۔ گھر کا دروازہ کھلا رکھتا ہوں کہ اس میں کوئی سامان ہی نہیں جو کسی چور کے لیے باعثِ کشش

ہو دامنِ زیرپا حجرے میں مغموم بیٹھا ہوں۔ میرا عیش بس رقصِ بسمل ہی کا عیش تھا۔ ایک چیز میسّر آئی تو اس کا لازمہ جو دوسری چیز تھی جس کے بغیر وہ بے کار تھی، دستیاب نہ ہوئی ؎

اگر تافتم رشتہ گوہر شکست
وگر یافتم بادہ ساغر شکست

میری آلودۂ شراب گدڑی کو کیا دیکھتا ہے اس کے اندر جیرتوں اور انگڑائیوں سے فرسودہ اور خستہ جسم ہے۔ اسے دیکھ کہ کس قدر قابلِ رحم ہے ؎

چہ خواہی کہ دلقِ مے آلودِ من
ببیں جسمِ خمیازہ فرسودِ من

ہمسائے ہمدرد اور موافق نہ ملے۔ اور یہ بے کسی دیکھ کر سرمایہ ایسوں سے طلب کرتا رہا ہوں جو خود نادار اور بے مایہ تھے۔ کمینوں کے احسان سے سرزمین پر رکھے ہوئے اور حقیر انسانوں کی قدم بوسی کرتے ہوئے لب چاک چاک۔ تو ہی قادر اور کفیلِ رزق تھا لیکن مجھے تو تو نے ایک طرف بے برگ و نوا رکھا اور دوسری طرف دل کو ہوا و ہوس کا شکار بنا دیا۔ مجھ ایسے باکمال شاعر کو جو طالبؔ، کلیمؔ، عرفیؔ اور خاقانیؔ سے کسی طرح کم نہ تھا کوئی ایسا بادشاہ میسر نہ آیا۔ جو مجھے اشرفیوں سے لدا ہوا ہاتھی بخش دیتا۔ کہ جب میں اس ہاتھی پر سوار ڈیوڑھی میں سے باہر سڑک پر نکلتا تو گداؤں پر اشرفیاں لٹاتا جاتا۔ اس بیان میں غالبؔ نے اپنی خواہشات اور محرومی کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ میدانِ حشر میں بھی وہ اپنی خواہشات کو ناجائز نہیں سمجھتا۔ لیکن خواہشیں پیدا کر نا پھر انھیں پورا کرنے کے سامان مہیا نہ کرنے کا الزام خدا پر لگاتا ہے۔ وہاں بھی اپنی رندانہ خواہشیں نہیں چھپاتا اور ہوس کو ہوس سمجھ کر اس سے تائب نہیں۔ دنیا میں اپنے حرمان کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

؎ نہ نازک نگارے کہ نازش کشم　　　بہ بوسہ زلفِ درازش کشم
بداں عمرِ ناخوش کہ من داشتم　　　زجاں خارہ و پیرہن داشتم

ان ہوسوں اور حسرتوں کا طوفان اب بھی اپنے دل کے اندر موجزن پاتا ہوں اور دل کا نالۂ خونیں اب بھی مجھے سنائی دے رہا ہے ؎

چو دل زیں ہوس ہا بجوش آیدے　　　ز دل بانگِ خونم بگوش آیدے
ہنوزم ہماں دل بجوش اندر است　　　ز دل بانگِ خونم بگوش اندر است

اس سے آگے بہشت پر تنقید کرتا ہے کہ اگر ہوسیں اسی قسم کی رہیں جو میرے سینے میں ہیں تو وہ جنت میں بھی پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتیں۔ اس پاک مے خانۂ بے خروش میں ہم جیسے رندوں کی خواہشیں پوری نہیں ہو سکتیں ؎

دراں پاک مے خانۂ بے خروش　　　چہ گنجائی شورشِ نای و نوش
سیہ مستیٔ ابر و باراں کجا　　　خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ　　　غمِ ہجر و ذوقِ وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار　　　چہ لذّت دہد وصلِ بے انتظار

ازیں ہا کہ پیوستہ مے خواست دل
ہنوزم ہماں حسرت آلا ست دل

غالبؔ کے اسی مضمون کے کچھ اشعار اردو میں بھی ہیں ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد　　　مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

گناہ اتنے نہ نکلیں گے جتنی حسرتیں ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے　　　بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اس حسرت کے مضمون کو اپنی خواہشیں گن چکنے کے بعد اس بیان میں بھی دہرایا ہے کہ اگر حساب ہی لینا ہے تو گناہوں اور حسرتوں دونوں کا حساب لے۔ گناہ میرے ذمے اور خواہش پیدا کر کے اسے پورا نہ کرنے سے جو حسرت پیدا ہوئی وہ تیرے ذمے ایک پلڑے میں گناہ ڈالتا جا اور دوسرے میں نیکیاں جو شاید بہت کم وزن ہوں بلکہ حسرتیں ڈال کر پھر تول اور دیکھ کہ ہر جرم کے مقابلے میں ایک حسرت ہے یا نہیں بلکہ گمان غالب ہے کہ حسرتوں کی تعداد اور ان کا وزن زیادہ ہوگا اور گناہوں کا بوجھ مقابلتہً کم۔ تو عادل ہے اب خود ہی فیصلہ کر لے کہ ایسی حالت میں انصاف کا کیا تقاضا ہے۔ مجھ ایسے مظلوم سے گناہوں کی پرسش کرے گا تو رگِ دل کی کاوش سے خون کی ندیاں نکلیں گی۔ ایسی حالت میں عذاب و گزند کے بجائے تلافی کا مستحق ہوں ؎

چو پرسش رگے رابکاوو ز دل — دو صد دجلہ خونم تراوو ز دل
بہر جرم کز رہ ئے دفتر رسد — ز من حسرتے در برابر رسد
بفرمای کایں داوری چوں بود — کہ از جرم من حسرت افزوں بود
ہر آئینہ ہمچوں منے را پہ پند — تلافی فراخور بود نے گزند

اندراں روز کہ پرسش رود از ہرچہ گزشت
کاش باما سخن از حسرتِ مانیز کنند

ہم حسرتوں کو چھوڑتے ہیں تو پاداش سے قطع نظر کر۔ میں رندِ ناپارسا ضرور تھا۔ میرے فکر میں بھی ٹیڑھا پن تھا۔ ظاہر میں میں مسلمان دکھائی دیتا تھا لیکن طریقِ زندگی میں انداز کبرانہ تھا۔ پھر بھی تیری نازل کی ہوئی کتاب مقدس کو مانتا تھا اور تیرے النور نبیؐ کا ہوا خواہ تھا۔ بہر حال کافر نہ تھا اس لیے رہائی کا حکم ہونا چاہیے ؎

کہ البتہ ایں رندِ ناپارسا
کج اندیشہ گبرِ مسلماں نما

SALEEM LIBRARY
1/8 Sher ...wala Gate,
Line Subhan Khan Lahore.

طوفانِ آرزو

اکثر حکما اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زندگی بلکہ ساری ہستی آرزو کی پیداوار ہے مہاتما بدھ نے جب انفس و آفاق کی زندگی اور وجود کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور نفس کی گہرائیوں میں غوطے لگائے تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ساری کائنات مصائب سے لبریز ہے۔ اخلاقیات اور مذاہب میں علامات کا علاج تجویز کیا جاتا ہے۔ لیکن علتِ مرض کی بیخ کنی نہیں ہوتی۔ ہر علاج محض سرسری اور ہنگامی ہوتا ہے۔ آرزو پوری نہ ہو تو انسان مایوس اور مضطرب ہو جاتا ہے۔ اور پوری ہو جائے تو عین کامیابی کے لمحے میں اس کی لذت جاتی رہتی ہے نفس کے ہاتھ میں خاکستر کی ایک مٹھی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ایک آرزو پوری ہوتے ہی دوسری آرزوؤں کو جنم دیتی ہے پھر وہی ہوس، وہی اضطراب اور وہی جد و جہد شروع ہو جاتی ہے۔ اسی لئے قدرت کے کارخانے میں کہیں سکون نہیں۔ نہ ظاہر میں نہ باطن میں۔ زندگی دانتوں کے درد سے مشابہ ہے۔ اور دانتوں کی بیماری میں یہی نسخہ مجرّب ہے کہ علاجِ دنداں اخراجِ دنداں۔ ساری زندگی جڑ سے اکھاڑ دینی چاہیے۔ زندگی کی بیخ آرزو ہے، لہٰذا آرزوؤں کا قلع قمع ہونا چاہیے اسی فلسفہ حیات نے ہر جگہ فرار اور گریز کی تلقین کی اور اسی سے شرق و غرب میں رہبانیت پیدا ہوئی۔ ابتدائی عیسائیت بھی رہبانیت تھی۔ اور بدھ مت بھی اصل میں رہبانیت ہی کی تعلیم دیتا تھا۔ عام ہندو فلسفہ بھی اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ کسی قسم کے اعمال سے نجات نہیں ہو سکتی۔ اصل نجات زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام ہے۔ ہر عمل نیک ہو یا بد لازماً اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے اور آواگون میں یہ نتیجہ نئے جنم پہ نئے روپ سے نمایاں ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ ازلی اور لامتناہی ہے۔ طریقِ نجات فقط یہی ہے کہ گیان سے آدمی